© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

پچھلے مہینے اِن صفحات میں جو دستوری تجاویز پیش کی گئی تھیں اُن میں ہمارے پیش نظر صرف یہ امر تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو اُن خاص دستوری نکات کے بارے میں صحیح مشورہ دیا جائے جن کے متعلق سابق دستوری سفارشات اور اربابِ حکومت کے عام رجحان کو دیکھتے ہوئے ہمیں اندیشہ تھا کہ ہمارے ملک کے دستور ساز حضرات غلط نقطۂ نظر اختیار کرنے والے ہیں۔ اسی غرض کے لیے ہم نے کوشش کی کہ ایک مختصر تحریر میں اپنی تمام تجاویز بیک وقت پیش کردیں۔ ہر تجویز کے ساتھ اس کے دلائل اور امکانی شبہات کے جوابات درج کیے جاتے تو سلسلۂ کلام دراز ہوجاتا اور وہ فائدہ حاصل نہ ہوتا جو ایک مختصر تحریر سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ لیکن اِن تجاویز کی اشاعت کے بعد مختلف حلقوں سے ہمارے پاس جو سوالات شبہات اور اعتراضات آئے ہیں، ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ ہماری تجاویز میں سے کم از کم بعض تجاویز ایسی ضرور ہیں جن کی مزید تشریح درکار ہے

پہلا اعتراض ایک نامور بیرسٹر صاحب کی طرف سے ہماری اس تجویز پر آیا ہے کہ دستور کی ایک مستقل دفعہ کی رو سے قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون پاس کرنا مجالسِ قانون ساز کے دائرہ اختیار سے خارج کردیا جائے، اور ہر شہری کو یہ حق دیا جائے کہ وہ سپریم کورٹ میں کسی قانون کو اس بنیاد پر چیلنج کرسکے۔ اس پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آپ اس طرح قوانین کے موافقِ کتاب و سنت ہونے کا آخری فیصلہ سپریم کورٹ کے ججوں پر چھوڑنا چاہتے ہیں، حالانکہ ابھی ایک مدت دراز تک یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ہمارے جج اِس معاملے میں صحیح فیصلہ دے سکیں گے۔

بلا شبہ یہ ایک وزنی اعتراض ہے، اور ہم اس سے اور اس کے وزن سے پہلے بھی غافل نہ تھے لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے سامنے اس وقت جو پیچیدگی درپیش ہے اُس کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو وہ تسلیم کرے گا کہ بحالت موجودہ اس کا کوئی دوسرا حل اتنا اطمینان بخش بھی نہیں ہے جتنا ہمارا تجویز کردہ حل ہے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ "ایک اسلامی ریاست میں کسی لیجسلیچر کو قرآن و سنت کے خلاف قانون بنانے کا مجاز نہ ہونا چاہیے"، یہ بالکل ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جس سے کوئی مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے اختلاف نہیں کر سکتا، بلکہ اس سے اختلاف کر کے کوئی شخص مسلمان بھی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس کو تو بہر حال ہمارے دستور میں ثبت ہونا چاہیے، اور اس کی حیثیت محض ایک "رہنما اصول" کی نہیں بلکہ ایک قطعی دستوری حکم کی ہونی چاہیے تاکہ اُس پر قانونی نتائج مترتب ہو سکیں۔ لیکن آگے بڑھ کر جس مقام سے پیچیدگی کا آغاز ہوتا ہے وہ یہ سوال ہے کہ کسی قانون کے موافقِ کتاب و سنت یا مخالفِ کتاب و سنت ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ عملاً اس کے تین ہی جواب ممکن ہیں :-

ایک یہ کہ اس کا آخری فیصلہ خود مجلسِ قانون ساز پر چھوڑا جائے۔

دوسرے یہ کہ علماء کی ایک مجلس اس کا فیصلہ کرے۔

تیسرے یہ کہ اس معاملے میں سپریم کورٹ پر اعتماد کیا جائے۔

ان میں سے پہلی صورت اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ جب تک رائے عام کی کافی تربیت نہ ہو جائے اور جب تک اس ملک میں انتخابات دھن اور دھونس اور دھوکے اور دھاندلیوں کے اثرات سے محفوظ نہ ہوں، اور جب تک مجالس قانون ساز پارٹی سسٹم کی گندگیوں سے پاک نہ ہو جائیں، یہ امید ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ ہماری ان مجالس کی اکثریت ایسے ایماندار اور خدا ترس نمائندوں پر مشتمل ہو گی جو دستور کی اس دفعہ کا وہ احترام ملحوظ رکھیں گے جو ایک سچے مسلمان کو رکھنا چاہیے۔ اس لیے ابھی وہ وقت بہت دُور ہے جب اس ملک کی نمائندہ مجلسیں اس اعتماد کی مستحق ہو سکیں کہ ہم اپنے دین و ایمان کا ایسا اہم معاملہ اطمینان کے ساتھ ان کے حوالے کر دیں۔ اس حقیقت کو خود دستور ساز اسمبلی کے ارکان جتنا جانتے ہیں شاید کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ آپ جب چاہیں ان میں سے ایک ایک شخص کے ہاتھ پر قرآن رکھ کر پوچھ لیں۔ اگر آپ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اطمینان دلا دیں گے کہ اس کی رائے شائع نہ کی جائے گی تو انشاء اللہ ان میں سے ہر شخص یہ شہادت دیگا کہ اس معاملے میں خود اس کی اپنی اسمبلی اعتماد کی مستحق نہیں ہے۔

دوسری صورت میں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان علماء کو منتخب کون کرے گا؟ کیا عوام جن کے ووٹ کا حشر ہم ابھی پنجاب، سرحد اور بہاولپور میں دیکھ چکے ہیں؟ یا خود مجلس قانون ساز جس کے ارکان اپنی اپنی پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کی پیش کی ہوئی فہرست پر آنکھیں بند کرکے ووٹ دیا کرتے ہیں؟ اگر یہی دونوں طریقے مجلس علماء کے انتخاب کے ہیں، تو ان میں سے کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں ہے جس سے حق پرست اور خدا ترس علماء کے منتخب ہونے کی امید کی جا سکے۔

اب صرف تیسری صورت ہی رہ جاتی ہے اور ہم بحالت موجودہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے جج بالعموم دین کا علم نہیں رکھتے، اور ان میں سے اکثر کے ذاتی رجحانات بھی ہمارے نزدیک قابلِ اطمینان نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے جج سیاسی لیڈروں کی بہ نسبت زیادہ ایماندار ہیں، اور ہمیں یہ اعتماد ہے کہ اگر ایک منصف کی حیثیت سے ان کے سامنے کسی قانون کے موافقِ کتاب وسنت یا مخالفِ کتاب وسنت ہونے کا سوال پیش ہو، تو وہ انشاء اللہ فریقین کے دلائل کا موازنہ کرکے ہی فیصلہ دیں گے، اپنی ذاتی خواہشات پر کوئی من مانا حکم نہیں لگا دینگے۔

دوسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ سرکاری افسروں کے خلاف عوام الناس کو عدالتوں سے چارہ جوئی کرنے کا غیر مشروط حق دیا جائے اور اس راہ سے وہ قیود ہٹا دی جائیں جو انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں عائد کی تھیں۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح تو سرکاری افسروں کے لیے اپنے فرائضِ منصبی انجام دینا مشکل ہو جائے گا۔

اس اعتراض کا مختصر جواب تو ہماری انہی تجاویز میں موجود ہے، لیکن پوری صورتِ معاملہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آ جائے۔

انگریزی حکومت نے اپنے دور میں جو ضابطۂ فوجداری مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۱۹۷ یہ تھی کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تین قسم کے سرکاری ملازم اگر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے کسی جرم یا تعدی کے مرتکب ہوں تو لوکل گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر ان کے خلاف کوئی عدالت کسی درخواست یا استغاثے کی سماعت نہیں کر سکتی۔ ایک جج جو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹ کے معنی میں جج ہو، دوسرے مجسٹریٹ، تیسرے کوئی ایسا عہدہ دار جو لوکل گورنمنٹ یا اس سے اونچے درجے کی حکومت کے حکم یا منظوری کے بغیر اپنے عہدے سے نہ ہٹایا جا سکتا ہو۔ علاوہ بریں یہ دفعہ لوکل گورنمنٹ ہی کو یہ اختیار دیتی تھی کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کس جرم یا جرائم پر کون کس طریقے سے کارروائی کریگا اور کونسی عدالت اس کی سماعت کرے گی۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں اس کے اندر یہ ترمیم کی گئی کہ مرکزی حکومت کے ملازمین کے معاملے میں ان اختیارات کو گورنر جنرل، اور صوبائی ملازمین کے معاملے میں گورنر، اپنی انفرادی رائے سے (نہ کہ اپنے وزراء کے مشورے سے) استعمال کریں گے۔

اسی طرح انہوں نے ضابطۂ دیوانی کی دفعہ ۸۰ میں یہ رکھا تھا کہ کسی عدالت میں کسی سرکاری افسر کے خلاف کسی ایسے معاملے سے متعلق جو اس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کیا ہو کوئی دعویٰ اس وقت تک دائر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ادخالِ دعویٰ سے دو مہینے پہلے اُس افسر کو اس امر کی باقاعدہ اطلاع نہ دے دی گئی ہو کہ اس کے خلاف کیا شکایت ہے، اور شکایت کرنے والا کس قسم کی دادرسی چاہتا ہے، اور شکایت کرنے والے کا نام اور پتہ کیا ہے۔ پھر دفعہ ۸۲ میں یہ تھا کہ اگر عدالت اس طرح کے مقدمہ میں مدعا علیہ کے خلاف ڈگری دے اور مدتِ مقررہ کے اندر اس کی تعمیل نہ ہو تو عدالت اس کی رپورٹ لوکل گورنمنٹ کو بھیجے گی اور اجرائے ڈگری کا حکم اس وقت تک نہ دیا جا سکے گا جب تک کہ اس رپورٹ پر تین مہینے نہ گزر جائیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے سرکاری ملازموں کو اس طرح کا تحفظ خود انگلستان میں حاصل نہ تھا۔ مگر ہندوستان میں انگریزوں نے یہ تحفظ ان کو اس لیے فراہم کر کے دیا کہ دراصل یہاں وہ پبلک کے ملازم نہ تھے بلکہ بیرونی آقاؤں کے ملازم تھے، اور غلام پبلک پر حکومت اور اس کے کارکنوں کا دبدبہ بٹھانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ایسے تحفظ کی ضرورت تھی۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ جن ملازموں کے ذریعہ سے وہ اس پبلک کو دبا کر رکھتی ہے، وہ اگر قانونی اختیارات سے تجاوز کر کے بھی اس پبلک کی جان، مال یا آبرو پر دست درازی کریں تو اسے ان کے خلاف براہِ راست عدالتوں سے چارہ جوئی کا موقع حاصل نہ ہو بلکہ حکومت کے سب سے بڑے ایجنٹوں (گورنر جنرل اور گورنروں) سے اجازت لے کر ہی ان پر کوئی دعویٰ کیا جا سکے۔

یہ نظریہ قیام پاکستان سے پہلے تو اپنی کوئی منطقی بنیاد رکھتا تھا خواہ وہ منطق وحشیانہ طاقت کی منطق ہی سہی۔ مگر جب قیام پاکستان کے بعد ہماری دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹی نے بنیادی اصولوں کے متعلق اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کی تو ہم اس میں یہ مضمون دیکھ کر حیران رہ گئے کہ "سرکاری افسروں کو جو تحفظات ضابطۂ فوجداری و دیوانی کی مذکورۂ بالا دفعات میں دیئے گئے ہیں ان میں ترمیم، تنسیخ یا تحدید کی غرض سے کوئی بل کسی مرکزی یا صوبائی مجلس قانون ساز میں صدرِ مملکت یا صدرِ صوبہ کی اجازت کے بغیر پیش نہیں ہو سکتا"۔ آزادی کے بعد اس عجیب و غریب تجویز کے اندر کوئی منطق ہمیں نظر نہ آسکی، اِلّا یہ کہ حکومت کا بنیادی نظریہ اب بھی وہی ہو جو ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی کی تدوین کے وقت تھا۔ اس تجویز کو اگر اب قبول کیا جاتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ملازمین جس طرح پہلے پبلک کے ملازم نہ تھے اسی طرح اب بھی نہیں ہیں۔ پہلے یہ شاہ برطانیہ کے ملازم تھے، اب "صدرِ مملکت" نامی ایک بادشاہ کے ملازم ہیں۔ پہلے ان کا کام انگریز کے لیے "دیسی" لوگوں کو دبا کر رکھنا تھا، اب ان کا کام خود دیسی آقاؤں کے لیے انہیں دبا کر رکھنا ہے۔ پبلک کے نمائندے پہلے بھی ان کے حقوق و امتیازات پر ہاتھ ڈالنے کے مجاز نہ تھے، اب بھی وہ ان کے اصل آقا یعنی صدرِ مملکت سے پوچھے بغیر کوئی ایسا بل نہیں لا سکتے جو ان حقوق و امتیازات میں کوئی کمی کرتا ہو۔ پبلک پہلے بھی سرچشمۂ اقتدار نہ تھی، اب بھی اس کی وہی غلامانہ حیثیت برقرار ہے، ورنہ اُس کی نمائندہ اسمبلی کا اسی کے ملازموں کے بارے میں کسی بل پر بحث نہ کر سکنا کیا معنی؟ اور یہ صدرِ مملکت صاحب ہوتے کون ہیں کہ پبلک کے نمائندے پبلک ملازمین کے بارے میں ان سے پوچھ کر کوئی بل لائیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارا اولین اعتراض تو اس سراسر نامعقول اور بیہودہ تجویز پر ہے۔ دوسرا اصولی اعتراض ہمیں بجائے خود اُن دفعات پر ہے جو ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی میں اب تک موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری افسر اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے کسی ایسی زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے جس کا وہ ازروئے قانون مجاز نہیں ہے، تو آخر کیوں حکومت سے پوچھے بغیر اس کے خلاف فوجداری استغاثہ نہ کیا جا سکے؟ اور کیوں اس پر دیوانی دعویٰ کرنے سے پہلے ۶۰ دن کے نوٹس کی ضرورت ہو؟ پبلک کے دوسرے آدمیوں کی ایسی ہی زیادتیوں پر استغاثہ کرنے کے لیے ان حدود و قیود کی ضرورت کیوں نہیں ہے، اور ان افسر صاحبان میں کیا سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ ان کے معاملے میں اس کی ضرورت ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ اگر پبلک کو اس طرح سرکاری افسروں کے خلاف دعوے اور استغاثے کرنے کی کھلی اجازت دے دی جائے تو ان کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تو ایک مفروضہ پیش کرتے ہیں، اور یہاں حال یہ ہے کہ افسروں نے اس بیجا تحفظ کی بدولت پبلک کے لیے جینا مشکل کر دیا ہے۔ آخر یہ اسی تحفظ کا نتیجہ تو ہے کہ پاکستان کے ایک گاؤں پر پولیس کے سپاہی چند اعلیٰ افسروں کے اشارے پر سکھوں اور سیوا سنگھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے، انہوں نے صرف جانوں اور مالوں ہی پر ہاتھ نہ ڈالا بلکہ گاؤں بھر کی عورتوں کی آبروریزی کر ڈالی، اور ایک افسر نے علانیہ کہا کہ اس گاؤں کی آئندہ نسل صرف سپاہیوں کی نسل ہی ہونی چاہیے، مگر اس کے باوجود ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جا سکی، صرف اس لیے کہ خود پبلک کے مظلوم لوگ حکومت کی اجازت کے بغیر ان افسروں پر استغاثہ نہ کر سکتے تھے، اور حکومت (جو خود پولیس ہی کی بدولت برسراقتدار آئی تھی) اپنی پولیس کی وفاداری کو اپنی قوم کی عورتوں کی عصمت سے زیادہ قیمتی سمجھتی تھی۔ ان شرمناک واقعات کے بعد کوئی شریف آدمی کس منہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ ان سرکاری افسروں کو کام کرنے کے لیے اس قسم کے تحفظ کی ضرورت ہے؟ اس طرح کا تحفظ تو کام کرنے کے لیے نہیں بلکہ بدمعاشی کرنے کے لیے مددگار ہوتا ہے۔ کام کے لیے اس سے زیادہ کسی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سرکاری افسر کے خلاف بیجا استغاثہ کرے تو اس کے لیے کوئی سزا تجویز کر دی جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی سرکاری افسر کے خلاف حاکمانہ اختیارات کے بیجا استعمال کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو دوسرے ایسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی مجرموں کی بہ نسبت دوگنی سزا دی جائے۔

اس سلسلہ میں ایک صاف اور سیدھا سوال یہ ہے کہ حقیقت میں تحفظ کی ضرورت کس کو زیادہ ہے؟ حکومت کے اُن افسروں کو جنہیں پہلے ہی حاکمانہ دبدبہ و اقتدار حاصل ہے اور جن کی پشت پر نظم و نسق کی پوری طاقت ہے؟ یا اُن عوام کو جو اُن کے مقابلے میں پہلے ہی دبے ہوئے ہیں؟ کوئی معقول آدمی اس سوال کا یہ جواب نہیں دے سکتا کہ تحفظ کی ضرورت عوام کی بہ نسبت حکام کو زیادہ ہے۔ لیکن اگر ہمارے دستور ساز حضرات اس معاملے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ سرکاری افسروں کو مزید تحفظ کی ضرورت ہے اور عوام کو اس کی ضرورت نہیں ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ عقل اور انصاف سے ہی کورے نہیں ہیں بلکہ دغا باز بھی ہیں کہ نمائندگی کا پروانہ تو انہوں نے لیا عوام سے اور پھر دستور سازی کرنے بیٹھ گئے حکومت اور اس کے کارپردازوں کے مفاد میں۔ دراصل اس طرح کی دستور سازی اس ملک میں نازیوں کے "ہیرن فوک" کی طرح ایک "ملاء اعلیٰ" وجود میں لائے گی جس پر "عوام کالانعام" کی جانیں اور ان کے مال اور ان کی بہنوں اور بیٹیوں اور بیویوں کی عصمتیں مباح ہونگی۔ ایسا دستور سوچنے اور بنانے والے اگر نازیوں کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھ سکے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے "ہیرن فوک" کو خود وہی انجام دکھا دے گا۔

تیسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیے۔ اس باب میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سے اسلامی اصول ہیں جو ان کی رکنیت میں مانع ہیں اور قرآن و حدیث کے وہ کونسے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں؟۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کر دیں جن کی رکنیت کے لیے عورتوں کے استحقاق پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ ان مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے، اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہد صحابہ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث، گفتگو، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں اور بسا اوقات خود خلفاء ان کی رائے لیتے اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصول کا نام لے کر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں، وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں، وہی مالیات اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں، اور انہی کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھیے، قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَھُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (رکوع۔۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے، اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں قوامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اُن چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے

آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لیے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لیے۔ مگر یہاں اول تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطلقاً اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ کہا گیا ہے، فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوّام نہ بنایا بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا، آپ اسے تمام گھروں کے مجموعے، یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں؟ گھر کی قوامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوّام نہ بنائے گا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوّام بنا دے گا؟

اور دیکھیے، قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرۂ عمل یہ کہہ کر معیّن کر دیتا ہے کہ

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلیٰ (الاحزاب-۳۳) اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھیری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے تبرّج کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیالِ مبارک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جس کی وجہ سے وہ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کے لیے نااہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے اُن پر کوئی فوقیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلسلے کی ساری آیات صرف اہلِ بیتِ نبوت کے لیے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرّجِ جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انہیں غیر مردوں سے اس طرح باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ اُن کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبیؐ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے؟

اس کے بعد حدیث کی طرف آئیے۔ یہاں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:

اِذَا کَانَ اُمَرَاءُکُمْ شِرَارَکُمْ وَاَغْنِیَاءُکُمْ جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بُخَلَاءَكُمْ وَأُمُوْرُكُمْ إِلَى نِسَاءِكُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ مِّنْ ظَهْرِهَا (ترمذی)

جب تمہارے دولتمند بخیل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ أَهْلَ فَارِسَ مَلَّكُوْا عَلَيْهِمْ بِنْتَ كِسْرَىٰ قَالَ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا أَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً (بخاری، احمد، نسائی، ترمذی)

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کیے ہوں

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے رہا یہ سوال کہ عورت کا دائرۂ عمل ہے کیا؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اُس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:-

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوُلْدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ (ابوداؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔

یہ ہے آیت وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کی صحیح تفسیر، اور اس کی مزید تفسیر وہ احادیث ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کمتر درجہ کے خارج از بیت فرائض و واجبات سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے

اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِيْ جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَّمْلُوْكٌ، أَوِ امْرَأَةٌ، أَوْ صَبِيٌّ، أَوْ مَرِيْضٌ۔ (ابوداؤد)

جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے بجز چار کے، غلام، عورت، بچہ اور مریض۔

عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ نُهِيْنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ۔ (بخاری)

ام عطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں، اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں، مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا ہے، دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے، اور تعمیل کے لیے شرط کے طور پر، عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ مسلمان کو، اگر وہ واقعی مسلمان ہے، پہلے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے، پھر وہ اپنے دماغی اطمینان کے لیے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو ورنہ میں خدا اور رسولؐ کا حکم نہ مانوں گا تو ہم اسے سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے، کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کے لیے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ تعمیل حکم کے لیے عقلی دلیل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے نہ کہ اس کے اندر!

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھیرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگ جمل میں نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ جس مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اُس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو، ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لیے مشعل ہدایت ہیں، مگر اس غرض کے لیے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، نہ اس غرض کے لیے کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں۔ پھر جس فعل کو اُسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا، اور جس پر بعد میں خود ام المومنینؓ بھی نادم ہوئیں، اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لیے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ اور ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے پُرزور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ: "آپ کے دامن کو قرآن نے ربا تی ص ۲۵ پر)

© rasailojaraid.com